آج کی بدلتی دنیا اور درپیش چیلنج

خالد رحمان*

تبدیلی ہمیشہ سے ہی انسانی زندگی کا اہم مظہر رہی ہے۔ تاہم، عصر حاضر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی کا عمل جس تیزی سے وقوع پذیر ہے ایسا پہلے کبھی نہ تھا۔ تبدیلی کے امکانات، وسعت اور پایداری کا دارو مدار ان عوامل پر ہوتا ہے جو تبدیلی کا محرک بنتے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین عامل تبدیلی کا رضا کارانہ اور اختیاری نوعیت کا ہونا اور متوقع طور پر مثبت نتائج کا حامل ہونا ہے۔ تبدیلی کو جب جبراً نافذ کیا جاتا ہے، خواہ یہ جبر بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، تو نتیجتاً تناؤ، غیر یقینی صورت حال اور عمومی بے چینی سر اٹھاتی ہیں۔ بلاشبہہ آج دنیا کو درپیش مسائل بہت بڑے ہیں اور ان سے نجات (تبدیلی) کے ہدف کا حصول تمام متعلقین کی طرف سے اعلیٰ ظرفی اور بڑے پن کا تقاضا کرتا ہے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کی دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں آرہی ہیں جن میں ٹکنالوجی کی ترقی، اقتصادی ترقی، معلومات تک تیز، آسان اور سستی رسائی، طب اور صحت کے علوم میں معجزات، نئے اور مؤثر ذرائع پیداوار، آمدورفت اور مواصلات کے دائرے میں آنے والی تبدیلیاں بہت نمایاں اور اہم ہیں۔ آج جب ہم اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ مکمل کر رہے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ ان تبدیلیوں نے انسانی زندگی میں عظیم انقلاب برپا کر دیا ہے۔ دنیا بھر کے عوام، معاشرے اور معیشتیں باہم ضم ہو رہے ہیں، فاصلے سکڑ رہے ہیں اور تیز ذرائع مواصلات کی بدولت انسانوں، سامان، سرمایے، معلومات اور علوم کی حرکت آسان تر ہو چکی ہے۔ اب جغرافیائی سرحدیں رکاوٹ نہیں رہی ہیں اور گویا خلائیں بھی مسخر ہو چکی ہیں۔

اس تناظر میں اگرچہ یہ بات درست ہے کہ تبدیلی زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی دائروں میں بہت تیزی سے نفوذ کر رہی ہے جن میں انسانی و سماجی تعلقات، علم و تعلیم، تمدن و معاشرہ، سیاست اور معیشت سب ہی شامل ہیں، لہٰذا اس میں انسانی ذہن اور زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے، جو خود تبدیلی کا مظہر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معیشت آج کی انسانی زندگی میں نمایاں ترین اور مرکزی مقام حاصل کر چکی ہے۔ اس کا اثر تمام شعبہ ہاے زندگی پر اس طرح حاوی ہو چکا ہے کہ درحقیقت تبدیلی کے ہر عمل کے پیچھے اصل قوت محرکہ یہی نظر آتی ہے۔

اگرچہ، معاشی محرک کے اس غلبے کے نتیجے میں غیر معمولی ترقی ہوئی لیکن اس کے نتیجے میں انسانی زندگی کی بنیادی اقدار بھی تبدیل ہوئی ہیں اور یہ صورت حال دورِ حاضر میں زندگی کے تمام گوشوں میں نمایاں منفی نتائج بھی در لائی ہے۔ سرمایے نے کلیدی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ زندگی کے کسی بھی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے اہم ترین کردار سرمایے کا ہے اور کثیر سرمایے کے حاملین کے لیے مواقع بھی زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس سارے عمل میں سرمایہ کار ہی سب سے زیادہ فوائد سمیٹتا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے طاقت ور ممالک میں دراصل معاشی طور پر مضبوط افراد و گروہ ہی اپنے ملک میں اور عالمی سطح پر فیصلہ سازی پر اثر انداز ہونے کے حوالے سے اہم کردار ادا کرتے ہیں خواہ یہ فیصلے سیاست کے حوالے سے ہوں، تنازعات اور جنگوں کے سلسلے میں یا تعلیم اور صحت عامہ جیسے سماجی شعبے میں ترقی کی بابت۔ یہاں تک کہ اقوام متحدہ، عالمی بنک اور عالمی مالیاتی ادارہ (آئی ایم ایف) جیسے بین الاقوامی اداروں میں فیصلہ سازی اور اثر اندازی میں مخصوص ممالک اور طاقتوں کے کردار کا انحصار بھی ان کی طرف سے کیے جانے والے مالی تعاون پر ہوتا ہے۔[۱] معاشروں اور قوموں کے اندر بھی افراد اور جماعتوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ کثیر سرمایے کے بغیر قیادت کے حصول یا اسے برقرار رکھنے کا سوچ بھی سکیں۔ نتیجتاً امن، ترقی، جمہوریت، انسانی حقوق، غربت کے خاتمہ اور سب کے لیے صحت و تعلیم کی ظاہری کوششوں کے باوجود بدلتی دنیا کے حقائق کچھ اور ہی داستان سناتے ہیں۔

تبدیلی کے اثرات

ممالک کے درمیان اور معاشروں کے اندر بھی عدم مساوات جڑیں پکڑتی جا رہی ہے،

خواہ یہ معاشرے ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر۔ صرف چند اقوام، بلکہ بیش تر صورتوں میں کچھ ادارے یا افراد کو کروڑوں کے ہجوم پر بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ کوئی انکشاف نہیں ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز پر دنیا کی مجموعی قومی پیداوار (GDP) کا ۸۷ فی صد صرف ۲۲ امیر ممالک میں پیدا ہوتا تھا، جب کہ دنیا کے باقی ماندہ ۱۷۰ ممالک میں ۸۰ فی صد عوام دنیا بھر کی مجموعی قومی پیداوار کے محض ۱۳ فی صد پر روح و بدن کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ گذشتہ ۲۰۰ برسوں میں اس خلیج میں حیران کن حد تک اضافہ ہوا ہے حتیٰ کہ امیر ترین ممالک میں بھی ۱۲ فی صد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔[۲]

دنیا کے سات متمول ترین افراد کے پاس ۴۱ غریب ممالک (جن کی آبادی ۵۶ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے)[۳] کی مجموعی قومی پیداوار سے زائد دولت ہے، جب کہ دنیا کے آدھے کے قریب عوام (تقریباً ۳؍ارب) دو ڈالر یومیہ سے کم آمدن پر گزارا کرتے ہیں۔ جو زندگی مشکل سے گزارتے ہیں اور دنیا میں رونما ہونے والی ترقی میں ان کے لیے کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہے۔ ایک ارب انسانوں کو حفظانِ صحت کے نظام تک رسائی حاصل نہیں۔ ایک ارب سے زائد لوگوں کو پینے کا صاف پانی دستیاب نہیں۔ ۸۰ کروڑ انسان بھوک اور خوراک کی کمیابی کا شکار ہیں اور ہر سال ڈیڑھ کروڑ بچے بھوک کے باعث موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔[۴] امیر امیر تر ہوتے جارہے اور غریب غریب تر ہو رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے مطابق کہیں اور نہیں، خود ریاست ہاے متحدہ امریکا میں تمام بڑی صنعتی اقوام سے زیادہ آمدن میں عدم مساوات پائی جاتی ہے۔[۵]

دولت، مادی فوائد اور معیشت کی بڑھتی ہوئی مرکزیت نے فرد، سماج اور تحفظ سے وابستہ غیر روایتی چیلنجوں کو جنم دیا ہے جو خاندانی نظام کی کمزوری، انفرادیت پسندی، منشیات اور انسانوں کی غیر قانونی آمد و رفت سے لے کر ماحولیاتی خطرات تک حاوی ہیں۔

ناہمواریاں صرف اقتصادی دولت اور سماجی شعبے تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کا عسکری قوت اور سیاسی میدان میں عدم توازن کے ساتھ بھی اختلاط ہو چکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کا دفاعی خرچ ۲۰۰۹ء تک ۱ء۵۳ کھرب امریکی ڈالر تک پہنچ چکا ہے۔ ۲۰۰۸ء کی نسبت حقیقی قدر میں یہ چھے فی صد اضافہ ہے،[۶] جب کہ ۲۰۰۰ء کے مقابلے میں ۴۹ فی صد ہے۔ صرف ۱۵ ممالک بلند ترین

اخراجات کے ساتھ دنیا کے کُل دفاعی اخراجات کا ۸۲ فی صد خرچ کرتے ہیں۔ امریکا موجودہ عالمی رجحان کا اصل سمت نما پیش کرتا ہے۔ اس کے دفاعی اخراجات دنیا کے مجموعی اخراجات کے نصف سے کچھ ہی کم، یعنی ۴۶ء۵ فی صد ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امریکی صدر اوباما، جنھوں نے تبدیلی کے نام پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی ہے اور انھیں امن کا نوبل انعام بھی مل چکا ہے، وہ بھی اس رجحان میں تبدیلی نہ لا سکے اور امریکا کے دفاعی اخراجات میں کوئی ٹھیراؤ رونما نہیں ہوا۔ امریکا کے بعد بہت فاصلے پر چین (عالمی دفاعی اخراجات کا ۶ء۶ فی صد)، فرانس (۴ء۲ فی صد)، برطانیہ (۳ء۸ فی صد) اور روس (۳ء۵ فی صد) آتے ہیں۔[۷]

کل عسکری اخراجات دنیا کی مجموعی قومی پیداوار کے ۲ء۷ فی صد کے برابر ہیں یا تخمیناً ۲۲۵ امریکی ڈالر فی کس۔ آج کرۂ ارض کو جن گمبھیر حالات کا سامنا ہے، ان خطیر عسکری اخراجات کا ایک معمولی حصہ دنیا کو ان سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس کثیر رقم کا موازنہ اگر دنیا میں امن و سلامتی کو یقینی بنانے والے عالمی ادارے کے مجموعی بجٹ کے ساتھ کیا جائے تو حالات کی سنگینی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ، اس کے تمام ذیلی ایجنسیاں اور فنڈ ہر سال ۳۰/ارب امریکی ڈالر خرچ کرتے ہیں، یعنی صرف چار امریکی ڈالر فی کس۔ یہ دنیا کی اکثر حکومتوں کے بجٹ کے مقابلے میں حقیر رقم ہے اور دنیا کے دفاعی بجٹ کے ۳ فی صد سے بھی کم ہے، جب کہ دو عشروں سے اقوام متحدہ کو مالی مشکلات درپیش ہیں اور اسے مجبوراً ہر شعبے میں اپنے منصوبوں کو کم کرنا پڑا ہے حالانکہ اس عرصے میں بہت سی نئی ذمہ داریوں نے سر اٹھایا ہے۔ کئی رکن ریاستوں نے اپنے تمام واجبات بھی ادا نہیں کیے، جب کہ کئی نے اقوام متحدہ کے رضاکارانہ فنڈ میں عطیات دینے بھی بند کر دیے ہیں۔ ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۹ء تک رکن ممالک کے ذمے عمومی بجٹ کے بقایاجات ۸۲ء۹ کروڑ امریکی ڈالر تک پہنچ چکے تھے جن میں سے ۹۳ فی صد امریکا کے واجبات ہیں۔[۸]

ہم اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یک طرفہ فیصلوں (unilateralism) اور پیشگی دفاعی حملوں (pre-emptive strikes) جیسے نظریات عملی طور پر ان ثمرات کو ضائع کر رہے ہیں جو دنیا نے بین الاقوامی قانون، انسانی حقوق، مساوات اور آزادی کے میدانوں میں حاصل کیے تھے۔ 'قومی مفادات' کے نام پر بین الاقوامی تعلقات

میں بالادستی اور طاقت کی سیاست کا دور دورہ ہے اور علاقائی تنازعات اور سلگتے ہوئے مسائل روز بروز سر اٹھا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل جیسے ادارے عضو معطل بن چکے ہیں۔[9]

اگرچہ اقوام متحدہ کے ارکان کی تعداد ۲۰۰ کے قریب ہے لیکن فیصلے کرنے اور ان کو دنیا پر نافذ کرنے کا اختیار صرف چند ایک کے پاس ہے، بلکہ کچھ معاملات میں عملاً صرف ایک کے پاس۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی توسیع کے مباحث کچھ عرصے سے جاری ہیں لیکن ان کا محور بھی یکساں ذہنیت کی حامل کچھ اور طاقتوں کو آگے لانا ہے جس کے باعث دنیا میں طاقت کا توازن مزید بگڑ جائے گا۔ علاوہ ازیں عدم توازن کا یہ معاملہ صرف فیصلہ سازی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ فیصلوں کا نفاذ بھی امتیازی طور پر ہوتا ہے۔ کمزور کو آسانی سے ہدف بنایا جا سکتا ہے، جب کہ طاقت ور بسہولت اقوام متحدہ کی قراردادوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ سرحدات کی خلاف ورزی کی جا سکتی ہے، قومی خودمختاری کا کوئی تقدس نہیں، زبردستی مسلط کی گئی اور اپنی مرضی سے تبدیل کی گئی حکومتوں کو تحفظ دیا جاتا ہے۔

یہ انداز عالمی نظام اور عالمی امن وسلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے جو غیر ریاستی عوامل کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنے حق میں منظم کریں جو ناانصافیوں سے تنگ آ چکے ہیں اور جن کا اعتماد عالمی نظام اور اس کے نمایندہ اداروں سے تیزی سے اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ کئی اور چیلنج جن کا دائرہ مختلف ریاستوں کے اندرونی اور ریاستوں کے باہم تنازعات اور مہلک جوہری ہتھیاروں کے افقی اور عمودی پھیلاؤ سے لے کر بین البراعظمی جرائم تک وسیع ہے اور جو ابھی تک حل طلب رہے ہیں، وہ اسی حقیقت کا ایک اور رخ ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم انسانی تحفظ کو لاحق غیر روایتی خطرات کا وقوع پذیر ہونا اور ان کی شدّت ہے۔ خوراک کا تحفظ (food security) قدرتی اسباب اور ان کی اپنی غیر دانش مندانہ پالیسیوں، دونوں وجوہات کی بنا پر سنگین شکل اختیار کر چکا ہے۔ توانائی کے تحفظ (energy security) کا معاملہ اتنا بڑا ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بڑے پیمانے پر ماحولیاتی آلودگی اور پانی کے مسئلے سے پیدا ہونے والے خطرات، نیز موسمیاتی تبدیلی کے ممکنہ اثرات توجہ طلب اور عملی اقدامات کے متقاضی ہیں۔

بلاشبہہ آج دنیا میں گہری تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ قدیم جغرافیائی و سیاسی حقائق کو آج بڑے بڑے تغیرات، انقلابات اور مدوجزر سے سابقہ درپیش ہے۔ نئی صف بندیاں، اتحاد،

دوستیاں اور دشمنیاں تشکیل پا رہی ہیں۔علاقائی طاقت کے نئے مراکز، چاہے عالمی نہ ہوں، کئی برسوں سے ظاہر ہو رہے ہیں اور اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے کوشاں ہیں۔ عالمی اور علاقائی سلامتی کو لاحق خطرات کے حوالے سے غیر ریاستی عناصر کا کردار نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے۔ عالمی معیشت اگرچہ ابھی تک عمومی طور پر ترقی یافتہ شمالی ممالک کے کنٹرول میں ہے لیکن اس میں بھی تبدیلی کا رجحان واضح دکھائی دیتا ہے۔چین، ترقی کی جانب غیر معمولی سبک رفتاری سے سفر کرتے ہوئے، عالمی معیشت کی اس تبدیلی کی قیادت کر رہا ہے۔چین کی شان دار ترقی کے ساتھ ہی ساتھ روس، بھارت اور برازیل جیسے ممالک کا عالمی اقتصادیات میں کردار اور حصّہ بھی نہ صرف بڑھ رہا ہے بلکہ اپنے اثرات بھی دکھا رہا ہے۔

لیکن کیا یہ عدم مساوات، نا انصافی، طاقت کے استعمال، جارحیت ،غربت اور بیماری، جہالت اور انسانوں، منشیات اور اسلحہ کی غیر قانونی نقل وحمل جیسے مذکورہ بالا مسائل کے تدارک کے لیے معاون ثابت ہو رہا ہے؟

مطلوبہ انقلاب: موجودہ افکار کے اس پار ایک نظر

جس منظرنامے پر اوپر بحث کی گئی وہ تبدیلی کے لیے بیک وقت چیلنج اور موقع پیش کرتا ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا مسائل میں سے ہر ایک کے حل کے لیے مخصوص اور متعین لائحہ عمل درکار ہے لیکن ان کے پایدار اور جامع حل کے لیے ان مسائل کی بنیادی وجوہات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے جن کی جڑیں زندگی اور ترقی کے معاصر فلسفے میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے لیے بنیادی طور پر معاملات کو ابتداً فکری سطح پر طے کرنا ہوگا۔

بلاشبہہ انسانی زندگی سے وابستہ تنوع کے باعث شناخت اور باہم مسابقت کے لیے جدوجہد کا معاملہ انسانی نفسیات کا ایک فطری اور لازمی جزو ہے، تاہم امن اور ترقی کے فروغ کی خاطر ضرورت اس امر کی ہے کہ اس رجحان کو صحت مند مسابقت اور دوطرفہ فوائد (win-win situation) کی راہ پر ڈالنے کے لیے اس کی سمت متعین کی جائے۔

بدقسمتی سے survival of the fittest کے نظریے پر چلنے والا موجودہ نظام 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کا منظر پیش کر رہا ہے۔ یہ کبھی بھی صحت مند مقابلے کا ماحول فراہم نہیں کرسکتا کیونکہ

اس نظام نے انفرادی و اجتماعی سطح پر طاقت کے استعمال کو اتنی فوقیت دے دی ہے کہ اس کے آگے اخلاقی اصولوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ تنازعات ایسے حالات کا ناگزیر تقاضا بن جاتے ہیں۔

آج کی دنیا میں ہم یہی کچھ دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ نظریے کی بنیاد سرمایہ دارانہ طرز پر ہے جس کی زمام کار معاشی طور پر مستحکم ممالک کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترویج امدادی ایجنسیاں اور بین الاقوامی مالیاتی ادارے کر رہے ہیں جن میں سے قابل ذکر عالمی بنک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور بڑے کاروباری ادارے (کثیر الاقوامی اور بین الاقوامی کمپنیاں MNCs and TNCs) ہیں۔ سرمایے کی تشکیل، آزاد منڈی کی معیشت، نجکاری اور غیر ملکی امداد اسی نظریے اور نظام کے اہم عناصر ہیں جس میں معاشی فوائد کے حصول کے لیے اصولوں، اخلاقی اقدار اور سماجی و جمہوری تصورات کی کوئی حقیقی اہمیت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشی مفاد کے حصول کی راہ میں صحیح و غلط، جائز و ناجائز، مساوات و عدم مساوات اور انصاف و ناانصافی جیسے تصورات بے معنی ہو چکے ہیں۔ بجاے اس کے کہ 'سماجی ترقی کے پیش نظر اخلاقی و اصولی انتخاب کو جانا اور اپنایا جائے'' بڑھوتری کے حجم و شرح، سرمایے کی تشکیل، بیرونی امداد و وسائل کی تخصیص، زیادہ سے زیادہ منافع خوری اور انفرادی فوائد کا جنون عروج پر ہے اور انسانی فلاح اور سماجی بہبود سمیت دیگر تمام امور کو بالاے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ 'انصاف اور انسانی بہبود' کے بجاے 'مہارت' اس نظریے میں نصب العین بن چکی ہے جس میں اصل زور نمو پذیری (growth) پر ہے۔ غربت میں کمی اور عوامی بہبود کے اہداف کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے نتیجے میں خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس نظریے کو 'انسانیت کے نصب العین کے ساتھ ترقی و پیش قدمی' سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔[۱۰]

بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں اس نظریے کا اظہار 'قومی مفاد' کی سوچ ہے۔ دنیا کے ممالک کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی تنفیذ کے حوالے سے اخلاقی اور فکری پہلو کو ترویج دے کر حقیقی معنوں میں عملاً نافذ کرنا ہوگا۔ اگر عالمی نظام کلیتاً 'قومی مفاد' کی سوچ کے تحت ہی چلتا رہا تو کمزور اقوام کے مفادات مضبوط اور طاقت ور اقوام کے ہاتھوں پامال ہوتے رہیں گے۔ مختلف ممالک کا باہم انحصار (interdependence) ہی وہ واحد محرک نہیں جس کی وجہ سے باہمی تعامل، مذاکرات اور تعاون کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے، ہمہ پہلو اور پایدار ترقی بھی اس چیز کا تقاضا کرتی

ہے کہ بین الاقوامی سیاسی و اقتصادی تعلقات میں نئی منہج اور نئی بصیرت کے ساتھ فکری انقلاب رونما ہو، یعنی دوسروں کے مفادات کی قیمت پر اپنے قومی مفاد کے حصول کے بجاے ایسے تعلقات کی طرف جس میں توجہ کا مرکز مجموعی اور ہمہ جہت انسانی و سماجی بہبود ہو اور جس کی بنیاد تعاون، باہمی احترام، دوطرفہ مفاد اور باہمی منافع پر ہو۔ (یہ تحریر اُس مقالے کا ایک حصّہ ہے جو مقالہ نگار نے (CICIR) China Institute of Contemporary International Relations کے زیراہتمام ۲۳ تا ۲۵ ستمبر ۲۰۱۰ء کو بیجنگ میں منعقد ہونے والی کانفرنس بعنوان 'تغیّر پذیر دنیا اور چین' میں پیش کیا۔)

★مقالہ نگار انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔

حواشی

۱- ان اداروں کو جمہوری نہیں کہا جاسکتا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پانچ ممالک مستقل رکن ہیں جو ویٹو پاور رکھتے ہیں۔ ویٹو کی حامل ان پانچ طاقتوں میں سے امریکا اپنا اثر ورسوخ سب سے زیادہ استعمال کرتا ہے جس کی ایک وجہ تنظیم کے ساتھ اس کا زیادہ مالی تعاون ہے۔ آئی ایم ایف میں ووٹ کی صلاحیت فنڈ میں زیادہ سرمایہ کاری کی بنا پر متعین کی جاتی ہے۔ گویا فیصلہ سازی ''ایک رکن ایک ووٹ'' کی بنیاد پر نہیں بلکہ ''ایک ڈالر ایک ووٹ'' کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ WTO کا طریقہ کار دیگر بین الاقوامی تنظیموں سے مختلف ہے۔ اس میں ہر ملک کو ووٹ کا مساوی حق حاصل ہے لیکن غیرمعمولی انسانی، دانشورانہ اور مالی وسائل اور سیاسی اثر ورسوخ کی وجہ سے مال دار ممالک کا فیصلہ سازی میں کافی دخل ہوتا ہے۔

۲- انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کے جرنل *Policy Pespectives* جنوری تا جون ۲۰۰۶ء میں پروفیسر خورشید احمد کا مضمون "Challenges and Prospects for Muslims"

3. Anup Shah, "Poverty Facts and Stats," Global Issues, last up-dated March 28, 2010,

4. Anup Shah, "Health Issues," Global Issues, last up-dated March 21, 2010, http://www.globalissues.org/issue/587/health-issues; *Global Crisis News*,"Over one billion people lack access to safe drinking water," March 22, 2010, http://www.globalcrisisnews.com/environment/over-one-billion-people-lack-access-to-safe-drinking water/id=1482/;"The World Hunger Problems, Facts Figures and Statistics," http://library.thinkquest.org/C002291/high/present/stats.htm (accessed August 18, 2010).

5. http://theeconomiccollapseblog.com/archives/more-than-1-in-5-american-children-are-now-living-below-the-poverty-line (accessed August 18, 2010).

6. Anup Shah, "World Military Spending," Global Issues, last up-dated July 07, 2010, http://www.globalissues.org/article/75/world-military-spending, quoting Stockholm International Peace Research Institute (SIPRI)'s 2010 Year Book on Armaments, Disarmament and International Security, (accessed August 18, 2010).

۷- امریکا کے دفاعی اخراجات میں ۲۰۰۰ء میں جارج ڈبلیو بش سے کچھ پہلے حقیقی اضافہ 63 فیصد ہوا۔ بحوالہ: SIPRI Yearbook 2010, "Media Background-Military expenditure," 2-3, http://www.sipri.org/media/media/pressreleases/pressreleasetranslations/storypackage_milex

8. http://www.globalpolicy.org/un-reform/un-financial-crisis-9-27.html (accessed August 18, 2010)

۹- ''پیشگی دفاعی حملوں'' کا نظریہ، جس کے بعد ساری دنیا کی طرف سے اعتراضات کے باوجود عراق پر قبضہ کیا گیا، دنیا کے سب سے طاقت ور ملک کی طرف سے یکطرفہ فیصلوں کی سوچ کی واضح مثال ہے۔

۱۰- بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیے پروفیسر خورشید احمد کا پیش لفظ برائے: *Pakistan's Economic Journey Need For A New Paradigm*, by Fasih Uddin and Akram Swati, Islamabad: Institute of Policy Studies, 2009, pp.xii-xv.

۱۴۳۳ھ
2012ء

پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ سیرت ایوارڈ

پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ نے سیرت النبیؐ، اقبالیات اور مخطوطات کے حوالے سے ایک عظیم الشان لائبریری بیت الحکمت کے نام سے قائم کی۔

سیرت نبویؐ سے اُن کی محبت کی یاد میں اس ایوارڈ کا اجرا 2010ء میں کیا گیا۔

- اس مقابلے میں سیرت نبویؐ پر شائع ہونے والی نثری، مترجم اور منظوم کتب شامل کی جائیں گی۔
- اس مقابلے میں ۲۰۱۱ء کے دوران شائع ہونے والی کتب شامل ہوں گی۔
- ہر کتاب کی چار عدد کاپیاں ۱۵ محرم ۱۴۳۳ھ تک وصول ہوناچاہییں، بعد میں یا کم آنے والی کتابیں مقابلے میں شامل نہیں ہوں گی۔
- منصفین کا فیصلہ حتمی ہوگا اور اُس کا احترام کیا جائے گا فیصلے کا اعلان ربیع الاوّل میں کیا جائے گا۔

پہلا انعام: -/25000 روپے | دوسرا انعام: -/15000 روپے | تیسرا انعام: -/10000 روپے

پہلے سیرت ایوارڈ کے انعام یافتگان

اوّل: الصادق الامینؐ | دوسرا: نقوش پائے مصطفیؐ | تیسرا: محمدؐ پیغمبر اسلام کی سوانح حیات

کتابیں بھجوانے کا پتہ: بیت الحکمت 109 حبیب پارک بالمقابل منصورہ، ملتان روڈ لاہور 0300-9401474 0321-4589419 :.Ph